مولانا انعام اللہ *

# حضرت مولانا عطاء الرحمٰنؒ، ناظم تعلیمات علامہ بنوری ٹاؤن

# حیات وخدمات کا مختصر جائزہ

ماہنامہ الحق کے خصوصی شمارہ بنام "مشاہیر" (مکتوبات) کے دو عدد نسخے موصول ہوئے۔ فجزاکم اللہ خیرا وشکر مساعیکم السامیۃ وتقبل جہودکم المیمونۃ. اس شمارے کے "نقش آغاز" میں آپ نے پاکستان میں پھیلے ہوئے مدارس دینیہ کے سلسلہ ذہبیہ میں سے حادثاتی اموات کے ذریعے الگ ہونے والے چار اساطین علم کی شہادت پر ادارتی نوٹس لکھے ہیں۔ ایک مہینے کی مختصر مدت میں داغ مفارقت دینے والے کہنہ مشق مدرسین اور اپنی اپنی دلچسپی کے دینی میدانوں کے شہسوار علماء کی شہادت مدارس دینیہ کی تاریخ کے ان کربناک انوکھے واقعات میں سے ہے، جس نے حالیہ سالوں میں عام مسلمانوں کو بالعموم اور تشنگان علوم دینیہ اور دیگر متعلقین مدارس دینیہ کو ایسے ناقابل برداشت صدموں سے دوچار کر دیا ہے، جو زندگی بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے بالکل درست لکھا ہے کہ "حالات کے جبر کا کیا کہئے، کہ ادارتی صفحات کا مسلسل پانچواں صفحہ علمائے حق کی جدائی میں خون دل سے لکھ رہا ہوں، گذشتہ ایک ماہ سے مسلسل علمی و دینی حلقے پے درپے حادث کے جام پئے جا رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا حادثہ فاجعہ سر پر تیار کھڑا ہے۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ قیامت سے پہلے کیوں قیامت کی شروعات ہو گئیں ہیں" پے درپے علماء حق کے اٹھ جانے سے پیغمبر صادق ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

﴿إِن اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعًا ینتزعہ من العِباد ،لکن یقبض العلم بقبض العلمآء ،فإذا لم یُبقِ عالماً اتَّخذَ الناسُ رُؤوسًا جُھّالًا فَسُئِلُوْا،فأفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا﴾ (بخاری)

آپ نے جن علماء کرام کی شہادت کے تذکرہ کو ماہنامہ الحق کے ادارتی نوٹ میں موضوع سخن بنایا ہے، ان میں سے مولانا نصیب خان رحمہ اللہ کا تعلق تو آپ کے مدرسہ، جامعہ حقانیہ، ہی سے تھا، مرحوم جامعہ کے استاد حدیث تھے۔ مولانا سید محسن شاہ حقانی رحمہ اللہ بھی جامعہ حقانیہ ہی کے فارغ التحصیل اور جامعہ حلیمہ درہ پیزو کے مہتمم ومنتظم تھے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن، کراچی، کے فارغ التحصیل اور کئی ایک مدارس و مساجد میں درس وتدریس اور تقریر وتحریر کے ذریعے اشاعت دین کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ جبکہ حضرت مولانا عطاء

* مدیر جامعۃ الامام ابوحنیفہ وسینئر ریسرچ آفیسر، اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

الرحمٰن رحمہ اللہ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن، کراچی، ہی کے فارغ التحصیل تھے، اور عالم اسلام کے اس عظیم دینی مرکز میں استاد الحدیث اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے دین حق کی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کیے ہوئے تھے، نیز جامع مسجد صالح، صدر، کراچی، میں امامت وخطابت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ ان میں سے اول الذکر تینوں حضرات ملک عزیز میں جاری دہشت گردی کا شکار ہوئے، جبکہ حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید اپنی ہمشیرہ اور رفیق سفر وحضر (وقبر) مولانا عرفان حمید میمن شہید سمیت، بھوجا ایئر لائن کے حادثے میں جام شہادت نوش فرما گئے۔ مولانا شہید سے میرے کئی ایک خاندانی وروحانی رشتے تھے، آپ میرے ماموں زاد بھائی، سالے اور بہنوئی تھے، اور استاد ومربی بھی۔ آپ نے ان کی شہادت کے واقعے کو حسب ذیل عنوان سے معنون فرمایا ہے: ''ایک گوہر نایاب انسان حضرت مولانا عطاء الرحمٰن کی المناک جدائی'' کیا عجیب توافق ہے، مولانا شہید کے والد محترم (میرے ماموں جان)، جن کو اللہ تعالیٰ نے ضعف اور بیماری کی حالت میں ایک عظیم بیٹے اور معصوم صفت بیٹی کی المناک جدائی کی آزمائش وابتلاء کی بھٹی سے گزارنے کے لئے چنا ہے، واقعہ کے چند ہی دن بعد اچانک بچھڑنے والی اپنی اولاد کو یاد کر کے حافظ الپوری کا یہ شعر پڑھنے لگے:

اصلی گوہر ز ما دلاسہ پہ دریاب کے ڈوب شہ:: کہ ڈک سیند ونہ پسے اوچ کڑمہ پیدا بہ نشی۔

(گوہر نایاب میرے ہاتھ سے گر کر دریا برد ہوگیا، اب اگر بھرے دریاؤں کے پانی کو سکھا کر بھی میں اس کو تلاش کروں، تو ہاتھ نہیں آئے گا)

واقعتاً مولانا شہید ایک گوہر نایاب تھے، نہ صرف اپنے والدین اور عزیز واقارب کے لیے، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے شاگردوں، مقتدیوں، آپ جیسے دوست احباب، متعلقین اور عامۃ المسلمین کے لیے بھی، جبھی تو ان کے لیے غمزدہ والد محترم کی زبان ''اصلی گوہر'' کے الفاظ بولتی ہے، تو آپ کا قلم ''گوہر نایاب'' کے الفاظ لکھتا ہے۔ یہ توافق اسی لیے تو ہے کہ وہ واقعتاً ''گوہر نایاب'' تھے، اور انہی الفاظ کے صحیح اور سچے مصداق۔ اس ''گوہر نایاب'' کو سانچے میں ڈھالنے کے لئے دست قدرت نے ہم سب کی مادر علمی ''جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن کراچی'' جیسے علم وعرفان کے مرکز کا انتخاب کیا تھا، اور اس کو تراشنے اور واسطۃ العقد بنانے کے لئے وہاں کے جبال العلم جیسے اُولیاء وقت اساتذہ کرام کی آغوش تربیت کو نامزد کیا تھا۔

جامعہ حقانیہ سے عقیدت واحترام کا ہمارا پرانا خاندانی تعلق رہا ہے، میرے والد صاحب کے ماموں اور میرے استاد مولانا شمس تبریز رحمہ اللہ، جامعہ حقانیہ کے غالباً پہلے یا دوسرے سال کے فضلاء میں سے ہیں، مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھ رہے تھے، کہ تقسیم ہند کا عمل رونما ہوا، اس لئے علوم دینیہ کی تکمیل پاکستان میں کی، اور دورہ حدیث کی سند فضیلت جامعہ حقانیہ سے حاصل کی۔ فرمایا کرتے تھے، کہ مدرسے کا آغاز تھا، مطبخ کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا، اس لیے

مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ طلباء کے لیے اپنے گھر ہی میں تندور پر روٹیاں پکوا لیتے تھے، اور روٹیوں سے بھری ٹوکری سر پر رکھ کر مدرسہ لے آتے تھے۔ ایک دن پڑوسیوں نے شکایت کی کہ طلباء ہمارے کھیتوں میں آ کر درختوں کی ٹہنیاں توڑتے ہیں، اور نقصان کرتے ہیں۔ آپ نے طلباء کو جمع کیا، اور سمجھاتے ہوئے فرمایا: تمہیں لکڑیاں توڑنے کی کیا ضرورت پڑگئی ہے؟ تمہارے لیے تو میں اپنے گھر سے روٹیاں پکوا کر لاتا ہوں۔

جب ۱۹۷۶ء میں مولانا شہید نے میٹرک تک کی عصری تعلیم سے فراغت حاصل کی تو ان کو دینی تعلیم دلوانے اور آپ کے الفاظ میں ''گوہر نایاب'' بنانے کے لیے خاندان کے بزرگوں کی نگاہ انتخاب جن مدارس پر پڑی، جامعہ حقانیہ اس تعلق کی وجہ سے ان میں سرفہرست تھا۔ ماموں جان (مولانا شہید کے والد محترم) بتلاتے ہیں، کہ میں اور مولانا شمس تبریز صاحب رحمہ اللہ داخلہ کے بارے میں معلومات لینے کے لیے جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک گئے، دفتر میں مولانا سمیع الحق صاحب (مدظلہ العالی) سے ملاقات ہوئی، حاضری کا منشاء بتایا کہ بچے کے داخلے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور جامعہ کے اس وقت کے ناظم صاحب کو بلوا کر داخلہ کے متعلق ان کی رائے معلوم کی، جناب ناظم صاحب نے تاخیر سے آنے اور رہائش کے لیے جگہ کی قلت کی انتظامی رکاوٹ کا تذکرہ کیا، ہم نے بڑے درجوں کے ایک طالبعلم کے حوالے سے رہائش کا انتظام ہونے کی بات کی۔ اس طالبعلم کو بلوایا گیا اور ان سے وضاحت طلب کی گئی، غرض مولانا سمیع الحق صاحب داخلہ کی گنجائش نکالنے کی کوشش کرتے رہے، اور ناظم صاحب انتظامی رکاوٹوں کا تذکرہ فرماتے رہے اور یوں یہ داخلہ نہ ہو سکا۔ ادھر بچے کے دادا جان (باباجی رحمہ اللہ) کی مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ سے بھی شناسائی اور تعلق تھا، اور اپنے سفر کراچی میں مولانا بنوری کی بعد از عصر اصلاحی مجالس میں شرکت فرماتے رہتے تھے، اسی شناسائی اور تعلق کی بنیاد پر اس بچے کو ''گوہر نایاب'' بنانے کے لیے قدرت کی نگاہ انتخاب بنوری ٹاؤن پر پڑی، اور یوں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں داخلہ ممکن ہوگیا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج آپ نے ان کو ''گوہر نایاب'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ مولانا شہید چونکہ ہمیشہ نظامت کے منصب پر فائز رہے، پہلے ناظم دارالاقامہ تھے، اور بعد میں ناظم تعلیمات، اس لیے نظامت کے نشیب و فراز، باریکیوں اور تلخ و شیرین تجربات سے خوب واقف تھے، اسی لیے جب بھی کسی مجلس میں اپنے والد محترم کی زبانی یہ واقعہ سنتے، تو تبسم آمیز خوبصورت انداز میں بات کو ٹالتے ہوئے مولانا انوار الحق صاحب (نائب مہتمم، جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک) کا تذکرہ چھیڑ دیتے، اُسفار حرمین کی ملاقاتوں یا پھر وفاق المدارس کی میٹنگوں میں ہونے والی ملاقاتوں کا تذکرہ فرماتے اور مولانا انوار الحق صاحب سے سنی ہوئی دلچسپ باتوں کو انہی کے انداز میں نقل فرماتے، اور یوں پوری مجلس کشت زعفران بن جاتی. اور کبھی آپ کا بھی تذکرہ فرماتے، بالخصوص بیرون ملک اسفار کا حوالہ دیتے ہوئے دلچسپ واقعات سناتے۔ آپ نے بھی اپنے اداریتی نوٹ میں طویل ہوائی اسفار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ''سفر میں ساتھی کی ایک ایک چیز کا

خیال رکھنا اور ہر ممکن سہولت فراہم کرنا ان کا خاصہ تھا'' اور'' آپ جہاز میں اکثر برادرم عتیق الرحمٰن صاحب اور میرے ساتھ والی سیٹ پر تشریف رکھتے۔'' اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز گفتگو میں روداد سفر سناتے ہوئے ہم نے متعدد بار مولانا کی زبانی اس کا تذکرہ سنا۔ اسکا ظاہری سبب تو بہر حال آپ حضرات کا عزت وتکریم اور محبت وشفقت پر مبنی باہمی تعلق تھا، لیکن مولانا کی گفتگو کے بین السطور سے جو وجہ ہمیں سمجھ میں آتی ، بلکہ ہمیں بھی غیر محسوس انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ، وہ یہ تھی کہ آپ کے اندر تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر قسم کی بھی ٹھاٹ بھاٹ اور تکلفانہ طور طریقوں سے تو گویا آپ کو نفرت تھی، مناصب جلیلہ پر فائز ہوتے ہوئے ان دونوں باتوں کی رعایت کرنا ایک مشکل کام ہے، جس کے لیے حکمت وتدبر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تا کہ عزلت پسندی یا غیر سنجیدگی کا الزام اپنے سر نہ دھرلیا جائے۔ اس لیے آپ اپنے مرتبہ اور مقام کی رعایت کرتے ہوئے بڑوں سے تعظیم واحترام کے ساتھ ملتے، حال احوال پوچھتے، علمی گفتگو فرماتے، لیکن طویل اور بے تکلفی کی نشستوں کے لیے اپنے ہم عمر یا کم عمر ساتھیوں کا انتخاب فرماتے، اور شفقت ومحبت، عزت ودلجوئی، حوصلہ افزائی وتشجیع پر مبنی رویہ کا اظہار فرماتے۔

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ کی وہ بابرکت رات مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب حرم پاک میں ختم القرآن کے موقع پر امام حرم کی طویل رقت آمیز دعاؤں میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ہم تقریباً رات ایک بجے بیت اللہ شریف کے طواف کی سعادت حاصل کررہے تھے، کہ ملتزم کے بالکل سامنے آپ کے والد محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ العالی کے ساتھ ملاقات ہوئی، اسی لمحے جماعت اسلامی کے راہنما جناب محمد حسین محنتی (مولانا شہید کے مقتدی) بھی طواف کرتے ہوئے اسی جگہ پہنچ گئے۔ طواف روک کر ایک دوسرے سے ملے، حال احوال معلوم کیا، میں نے ازراہ تفنن کہا: گویا مطاف میں ایم ایم اے کا اجتماع ہوا۔ تینوں حضرات بڑے محظوظ ہوئے، مولانا شہید رحمہ اللہ نے دونوں حضرات کو اس جملے کی طرف دوبارہ سہ بارہ متوجہ کیا۔ طواف کے بعد میزاب رحمت کے سامنے بیٹھ گئے، اور جب تک آپ کے والد گرامی وہاں تشریف فرما رہے، مولانا شہید بھی نہیں اٹھے، حالانکہ پروگرام کے مطابق ہمیں جلدی کمرے میں جانا تھا۔ لیکن انکی مروت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ بڑوں کو چھوڑ کر مجلس سے اٹھ جائیں۔

وفاق المدارس کے تحت منعقد ہونے والے سالانہ امتحانات میں بحیثیت نگران اعلیٰ جامعہ حقانیہ میں مولانا شہید رحمہ اللہ کی ڈیوٹی تھی، اس سال آپ بھی امتحان دے رہے تھے۔ جمعرات کو پرچے کے اختتام کے وقت میں بھی اسلام آباد سے اکوڑہ خٹک پہنچا۔ مولانا شہید نے مجھے امتحان ہال میں بلایا، اور اپنی گفتگو کے آغاز ہی میں آپ کی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ راشد الحق صاحب نے امتحانی نزاکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا بہت خیال رکھا، اور کسی طالب علم کو انگلی اٹھانے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ چونکہ مولانا کی طبیعت بہت حساس تھی، کسی بھی طالب علم کی طرف سے اشارۃً، کنایۃً ایسی بات، جس سے کسی دوسرے طالب علم کے ساتھ ترجیحی رویے کی بو آتی ہو، آپ

کو پریشان کر دیتی ،اور کبھی کبھار تو الزام لگانے والے کی خوب اصلاح فرماتے ۔اس لیے آپ کا جب بھی تذکرہ فرماتے ،اس امتحان کا حوالہ ضرور دیا کرتے ۔اور بصراحت فرماتے ،کہ جناب راشد الحق صاحب نے امتحان میں ایسا اچھا رویہ اپنایا ،کہ کسی کو بھی بات کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آیا۔

مجھے یاد ہے کہ اس امتحان سے فراغت کے بعد جامعہ سے رخصت ہونے سے پہلے مولانا مغفور اللہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی ،دعائیں لیں اور رخصت ہوتے وقت اپنی عادت شریفہ کے مطابق جیب میں موجود قلم مولانا کو ہدیۃً دیا۔کمرے سے باہر آ کر فرمانے لگے کہ ہدیہ تو معمولی تھا ،لیکن مجھے یقین ہے کہ مولانا مغفور اللہ صاحب اس قلم کو جب بھی استعمال میں لائیں گے ،تو استاد حدیث ہونے کے ناطے ضرور حدیث کے الفاظ یا درود شریف کے کلمات تحریر فرمائیں گے ،اور یوں خدمت حدیث میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے گا ،جو قیامت کے دن شفاعت نبوی ﷺ کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔یاد رہے کہ مولانا مغفور اللہ صاحب سے آپ کا رشتہ محض یہی تھا کہ مولانا ایک بزرگ انسان ہیں ،قال اللہ اور قال الرسول میں ان کی زندگی کے قیمتی لمحات گزر رہے ہیں ،غالباً ان سے مولانا کی یہ پہلی ملاقات تھی ۔مولانا شہید مردم شناس بھی بہت تھے ،پہلی ہی ملاقات بلکہ ٹیلیفونک گفتگو میں بھی آدمی کو پہنچان لیتے ،اور اس کے مطابق تعلق رکھتے ۔مولانا مغفور اللہ صاحب سے کس حد تک عقیدت تھی ؟اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب رواں سال برادرم مولانا امداد اللہ صاحب نے حسب روایت الجامعۃ الاسلامیہ بابوزئی کی افتتاحی تقریب میں حافظ شوکت علی صاحب ،مدرس جامعہ حقانیہ کی وساطت سے مولانا مغفور اللہ صاحب کو مدعو کیا ،تو مولانا شہید نے حسب معمول ترحیبی کلمات ارشاد فرمائے ،اپنی گفتگو کا آغاز اس حدیث پاک سے کیا۔(اَلنَّاسُ کَاِبِلٍ مِائَۃٍ، لَاتَکَادُ تَجِدُ فِیْھَارَاحِلَۃً) (ابن ماجہ) پھر حدیث نبوی کی تشریح کرتے ہوئے جس عقیدت واحترام کے ساتھ مولانا مغفور اللہ صاحب کو اس حدیث شریف کا مصداق ٹھہرایا ،کم از کم میں نے اس سے قبل مولانا شہید کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا ،آپ کا والہانہ انداز گفتگو اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ آپ دل کی گہرائیوں سے علم وتقویٰ کے اعتبار سے مولانا کو ایسی شخصیت سمجھتے ہیں ،جو اپنی نظیر آپ ہیں ،جن کا شمار رجال کار میں ہوتا ہے ،اور جو ڈھونڈنے سے نہیں ملتے ۔اور یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں ،کہ مولانا شہید کے مزاج میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا ،محض مجلس آرائی یا داد تحسین حاصل کرنے کی غرض سے کسی کی تعریف کرنا آپ کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔

جامعہ حقانیہ ،اکوڑہ خٹک ،کے اکابر کے ساتھ عقیدت واحترام کے حوالے سے ایک اور معمولی سا واقعہ بھی عرض کیے دیتا ہوں ،چند سال پہلے زروبی ،صوابی ،کے ہمارے ایک ساتھی کے والد صاحب کے انتقال کی خبر ملی ۔اس وقت مولانا شہید بھی گاؤں میں تھے ،میں نے نماز جنازہ میں شرکت کے لیے زروبی جانے کا ارادہ ظاہر کیا ،تو فرمایا: میں بھی ساتھ چلتا ہوں ،جنازے میں شرکت بھی ہو جائے گی اور مفتی فرید صاحب (جو اس وقت تقریباً صاحب فراش تھے

) کی زیارت بھی ہو جائے گی۔ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد ہم لوگ مفتی صاحب کی مسجد میں غالباً عصر کی اذان کے بعد پہنچ گئے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ کو اطلاع دی گئی کہ کراچی کے چند علماء زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں، آپ وہیل چیر پر بیٹھ کر مسجد تشریف لے آئے، وضو بنایا، مصافحہ کرنے اور حال احوال معلوم کرنے کے بعد فوراً جیب میں موجود کل سرمایہ تقریباً (تین سو روپے) نکال کر اپنے پوتے کو دیئے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کی ہدایت کی، ہم نے دیر ہونے کا عذر پیش کیا، مفتی صاحب نے خلاف معمول ہمارا عذر قبول کیا، ان کے بیٹے نے بتایا کہ کچھ کھائے پیئے بغیر کسی مہمان کو اجازت دینا مفتی صاحب کی عادت نہیں ہے، آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اجازت مل گئی، تاہم مہمانوں کی خاطر تواضع نہ ہونے پر بعد میں ضرور ہماری تادیب ہوگی۔ مولانا شہید مفتی صاحب کے سامنے انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ بیٹھے رہے، جس طرح کوئی شاگرد اپنے استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ غیر محسوس طریقے سے مفتی صاحب کے ہاتھوں میں کچھ ہدیہ رکھ کر ہاتھوں پر بوسہ دیا، اور رخصت ہوئے۔ بظاہر یہ ایک معمول کی ملاقات تھی، لیکن جب بھی یہ منظر یاد آتا ہے، غیر اختیاری طور پر نگاہوں کے سامنے ایک ایسا نقشہ بنتا چلا جاتا، جو تواضع وانکساری، شفقت ومحبت، عقیدت واحترام، زہد وقناعت اور سخاوت واکرام جیسے اعلیٰ اسلامی اخلاق واوصاف سے مرصع ہو، جس کا تانا بانا اپنے وقت کی دو ایسی عظیم ہستیاں ہوں جن میں تقدم زمانی، عمر، جلالت قدر اور علم میں تفاوت کے باوجود کئی ایک چیزیں قدر مشترک تھیں۔ عالم اسلام کی دو عظیم جامعات (جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک اور جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن) کی مسند درس وتدریس، بالخصوص مسند حدیث پر جلوہ افروزی، دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگردوں کی عقیدت واحترام کے لیے دونوں کی شخصیتوں کی مرکزیت ومحوریت، علیٰ وجہ البصیرت مسلک حنفی ومشرب دیوبندی میں تصلب، زہد وقناعت، نام ونمود اور تشہیر ذات کے نت نئے طریقوں سے کوسوں دوری، وہ مشترک باتیں ہیں، جو مفتی فرید صاحب رحمہ اللہ اور مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمہ اللہ کی شخصیتوں میں نمایاں طور محسوس کی جاسکتی ہیں۔ تاہم اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہوسکتا ہے، جو دونوں کے قریب رہے ہوں، بات طول پکڑ رہی ہے، میں مزید وضاحت کے لیے صرف ایک چیز کا تذکرہ کرتا ہوں۔ جناب مفتی فرید صاحب کے شاگردوں سے سنا ہے، کہ جب ان کی تقریر ترمذی چھپنے کے مرحلے میں تھی، تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ انتہائی ہلکا کاغذ لگایا جائے، اور کل حقیقی اخراجات کو مطبوعہ نسخوں کی تعداد پر تقسیم کیا جائے، اور ہر نسخے کی وہی قیمت مقرر کی جائے، جو اس پر حقیقی خرچ آیا ہے، تاکہ بے وسیلہ تشنگان علوم دینیہ کے لیے خریدنا اور استفادہ کرنا ممکن اور آسان ہو۔ بحیثیت مفتی آپ ضرور جانتے تھے کہ چند پیسے زیادہ قیمت مقرر کر کے نفع کمانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، لیکن آپ کے فیاضانہ مزاج نے ازراہ مروت طلباء مدارس دینیہ سے نفع کمانا گوارا نہیں کیا۔ ادھر مولانا عطاء الرحمٰن شہید کا طرز عمل ملاحظہ کیجیے: ''چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس'' کے لیے ''تعلیم وتربیت'' کے نام سے چھپنی والی تین حصوں/ جلدوں پر مشتمل کتاب، جسکا چوتھا حصہ زیر طبع ہے، کو جس شبانہ روز

محنت، عرق ریزی اور تحقیق و جستجو کے ساتھ منصۂ شہود پر لائے، وہ واقفان حال ہی جانتے ہیں۔ لیکن حقوق طبع کس کے پاس محفوظ ہیں؟ کتاب کے ٹائٹل والے دو تین صفحات اس کے شاہد ہیں، جامع مسجد صالح، صدر کراچی کی سیڑھیوں کے نیچے چھوٹے سے کمرے سے شروع ہونے والی اس تحقیق و جستجو اور محنت کا دائرہ کراچی، صدر اور بندر روڈ کی پر ہجوم اور تنگ گلیوں، بابوزئی مردان کے کھیت کھلیانوں، نجی اور گھریلو محافل و مجالس، حرمین الشریفین کے اسفار و مقدس مقامات، افریقی ممالک (ساؤتھ افریقہ، زمبیا، کینیا وغیرہ) ویسٹ انڈیز، برازیل، لندن کے ہوائی اسفار، ایئر پورٹس کی انتظار گاہوں اور ان ممالک کے مدارس و مساجد میں منعقد ہونے والی نجی محافل و مجالس تک وسیع ہے۔ (چوتھے حصے کا مسودہ حادثے پر منتج ہونے والے سفر میں برائے نظر ثانی ساتھ تھا)، شاگردوں اور اساتذہ جامعہ کی پوری ایک ٹیم کو اس محنت شاقہ میں آغاز ہی سے اپنے ساتھ شریک کار رکھا تھا۔ تحقیق و جستجو کی ان تمام محنتوں کو سمیٹ کر ''جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، علامۃ بنوری ٹاؤن، کراچی'' کی ''مجلس دعوت و تحقیق اسلامی'' کی جھولی میں ڈال دیا، اس لیے کہ آپ کا پکا ایمان ویقین تھا، کہ ہماری جھولیوں میں اگر کچھ ہے، تو وہ مادر علمی کے اس چشمہ صافی سے ملا ہے، اگر یہ رشتہ منقطع ہوا، تو ہم تہی دامن ہیں، کسی بھی شکل میں حقوق طبع جامعہ کے علاوہ کہیں محفوظ کراتے، تو اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے ان کو اندیشہ تھا کہ ﴿یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا﴾ کے مصداق نہ بن جائیں، بلکہ آپ تو ایک قدم اور بھی آگے بڑھے، تصنیف و تالیف کے اس مسلمہ اصول کو بھی نظر انداز کیا کہ کتاب کا مصنف معلوم ہونا چاہیے، ورنہ جہالت مصنف کی وجہ سے تصنیف کا علمی و تحقیقی مقام غیر معتبر رہتا ہے، آپ نے کتاب کے کسی بھی صفحے پر اپنا نام لکھنا لکھوانا گوارا نہیں کیا۔ خود فرمایا کرتے تھے، کہ مفتی نظام الدین شہید رحمہ اللہ نے ''دعائیہ کلمات'' کے عنوان سے اپنی تحریر میں میرا نام لکھا تھا، لیکن میں نے تحریر پڑھ کر عرض کیا کہ آج میں ایک بے ادبی کرتا ہوں، اور جامعہ کے دفتر میں مفتی صاحب کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں نے ان کے ہاتھ سے تحریر کردہ اپنا نام کاٹ دیا، مفتی صاحب مسکرائے، اور میری اس ''بے ادبی'' کی تحسین فرمائی۔ اس انتظام کے باوجود آپ پھر بھی اس اندیشے کا اظہار فرماتے تھے کہ کہیں اس کتاب کو تجارت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ ''تعلیم و تربیت'' نامی اس کتاب کو جو مقبولیت ملی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس بے اصولی کو بھی تکوینی طور پر ایک اصول کا مرتبہ حاصل ہوا۔ آج ہمارے سامنے صرف و نحو کی کئی ایک کتابیں زیور طبع سے آراستہ موجود ہیں، جن پر مصنف کے نام کے بجائے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے، مرتبین: اساتذہ جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ مجھے نہیں معلوم، کہ آغاز میں یہ رائے کس نے دی؟ اور کس طرح جامعہ کے ارباب حل و عقد نے اس اصول سے اتفاق کیا؟، تاہم مجھے یقین ہے کہ اس میں مولانا شہید کی سوچ ضرور کارفرما ہوگی۔

مولانا شہید کے دل میں اکابر سے عقیدت واحترام اور اکابر پر اعتماد کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی، کہ کم عمر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اکابر سے مشابہت جیسی وہبی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا، جس پر یہ شعر پورا

پورا صادق آتا ہے: (این سعادت بزور بازو نیست: تانہ بخشد خدائے بخشندہ) یہی وجہ تھی کہ لباس اور ظاہری ہیئت میں انتہائی سادگی اختیار کرنے کے باوجود ان کی ذات اور شخصیت میں واقفان حال کو اکابر کی جھلک نظر آجاتی، چند سال پہلے کی بات ہے، مولانا کفایت اللہ صاحب، فاضل جامعہ حقانیہ و مدرس جامعہ فاروقیہ، حیات آباد، پشاور (استاد محترم مفتی رضاء الحق صاحب کے والد گرامی مولانا شمس الہادی صاحب رحمہ اللہ، سابق شیخ الحدیث، جامعہ اسلامیہ، اکوڑہ خٹک کے تلمیذ رشید اور خادم خاص) کے ہاں مولانا شہید کی معیت میں حاضری کا موقعہ ملا، مولانا کفایت اللہ صاحب کی مولانا شہید کے ساتھ یہ پہلی باقاعدہ ملاقات تھی، اس سے پہلے کوئی لمبا چوڑا تعارف یا شناسائی نہیں تھی، مولانا شہید بیٹھک (مہمان خانے) میں ایک جگہ پر تشریف فرما ہوئے، مولانا کفایت اللہ صاحب کافی دیر تک دیکھتے رہے، اور پھر بولے: شیخ صاحب (مولانا شمس الھادی صاحب) پشاور آمد کے موقع پر میرے گھر تشریف لاتے اور مجھے خدمت کا موقع فراہم کرتے، وفات سے چند دن پہلے آخری مرتبہ جب تشریف لائے تھے، تو اسی جگہ تشریف فرما تھے، جہاں آپ (مولانا شہید) تشریف فرما ہیں، آپ کو اس جگہ تشریف فرما دیکھ کر مجھے حضرت شیخ یاد آگئے۔

مجھے یقین ہے کہ مولانا شہید کی حیات میں متذکرہ بالا باتوں کا اظہار ناممکن تھا، بالخصوص میری زبان یا قلم سے اظہار پر تو اچھی خاصی ناراضگی ہوتی اور اب بھی ان کی روح ان باتوں کے دھرانے پر خوش نہیں ہوگی، تاہم یہ جرأت اس لیے کر رہا ہوں کہ شاید مجھ جیسے بے ہمت شاگردوں کو بھی اپنی ذات کو اس طرح کے خفاء و خمول کے پردہ میں رکھنے، اپنی مادر علمی پر فدا ہونے اور اکابر سے عقیدت واحترام اور ان پر اعتماد کرنے کی ہمت ہو، اور اس وطیرہ حیات کو اختیار کر کے اس طریقے سے مولانا شہید کے لیے صدقہ جاریہ کی ایک شکل بن جائے۔ برادرم جناب راشد الحق صاحب! بات بہت طویل ہوگئی، جو عموماً باعث ملال ہوتی ہے، لیکن شاید اس لیے باعث ملال نہ ہو، کہ مولانا شہید کی ذات موضوع سخن ہے، اور:

ماھر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الاحدیث یار کہ تکرار می کنم

نیز: أَعِدْ ذِكْرَ نُعْمَانَ لَنَا إِنَّ ذِكْرَهُ :: هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ

(نعمان (ابوحنیفہ رحمہ اللہ) کا تذکرہ بار بار کیجیے، اس لیے کہ ان کا تذکرہ مانند مشک ہے، جتنی بار الٹ پلٹ کرو گے، خوشبو مہکتی رہے گی)

بذریعہ ٹیلی فون آپ کا شکریہ ادا کیا تھا لیکن آپ کا حکم تھا کہ مولانا شہید کے بارے میں چند باتیں تحریر کروں، جن کو خط کی شکل میں تحریر کرنے کا باعث ''مشاہیر'' بنا۔ ''مشاہیر'' کے حوالے سے تعارفی مضامین پڑھ کر یہ خیال آیا کہ آپ بھی اپنے والد محترم کی طرح قدردان ہونگے۔